پروفیسر خالد شبیر احمد (قسط:۳۵)

ورق ورق زندگی

معروف شاعر ساغر صدیقی سے ملاقات:

گورنمنٹ کالج سول لائن میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک پڑھاتا رہا۔ اس عرصے میں جو وقت گزری انتہائی خوش کن، سرگرم اور ایک مثالی دورانیہ تھا۔ اس دوران کالج میں کئی تقریبات ہوئیں۔ جن دوستوں کے ساتھ یہ وقت بسر ہوا وہ ہر لحاظ سے بڑے لوگ اور اچھے دوست تھے۔ جن کی یادیں دل میں محفوظ ہیں انھیں بھلا دینا میرے بس کی بات نہیں۔ ایسی ہی ایک تقریب تاریخی مشاعرے کی تھی جسے آج بھی اپنے تصور کی سکرین پر دیکھتا ہوں تو انتہائی محظوظ ہوتا ہوں۔ شہر کے نامور شعراء کے علاوہ بیرونِ شہر سے بھی شعراء اس محفل مشاعرہ میں شریک ہوئے جن میں خاص طور پر ساغر صدیقی اور خضر تمیمی اس لیے قابلِ ذکر ہیں کہ انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ خضر تمیمی ایڈووکیٹ جن کے ہاں ایم۔اے کی تعلیم کے دوران میرا قیام تھا۔ میری درخواست پر ہی مشاعرے میں شریک ہوئے اُن کی مزاحیہ شاعری نے وہ رنگ جمایا کہ لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے جب تک وہ سٹیج سے اپنا کلام سناتے رہے سامعین بے تحاشا ہنستے رہے۔ پہلے انھوں نے ایک چھوٹی سی نظم پڑھی جس کا عنوان تھا: ''مجھ کو تینوں یکساں ہیں''

جب میں پڑھنے پر آجاؤں
بانگ درا......سعدی کی کریما......یا پیسہ اخبار
مجھ کو تینوں یکساں ہیں

بھوک سے جب بے بس ہو جاؤں
گوشت کی بوٹی......سوکھی روٹی......شلغم کا اچار
مجھ کو تینوں یکساں ہیں

عشق میں جب بے تاب ہو جاؤں
رنگیں لیلیٰ......نمکیں عذرا......یا جوتوں کا ہار
مجھ کو تینوں یکساں ہیں

جب میں اس دنیا سے جاؤں
ٹیکسی لاری......اونٹ سواری......یا کوئی موٹر کار
مجھ کو تینوں یکساں ہیں

اکبر آلہ آبادی نے انگریز شاعر ''سودے'' کی نظم کا منظوم ترجمہ ''آب لووَر'' کے نام سے کی۔ خضر تمیمی نے

''آبِ لووَر'' کی پیروڈی ''ہاتھ کی روانی'' کے عنوان سے کی جو ملک کے کئی رسالوں میں شائع ہوئی جس کے چند اشعار اس مشاعرے میں بھی پڑھے گئے۔ یہ ایک پیٹو کی کہانی ہے جو کسی دعوت پر اپنے ہاتھ دکھاتا نظر آتا ہے

کہیں شوربے میں نہاتا ہوا　　نوالے سے کشتی بناتا ہوا
وہ چمچے سے چلّو بناتا ہوا　　وہ آلو کو اُلّو بناتا ہوا
سویّوں پہ سو جاں سے مرتا ہوا　　اُدھر لاڈ لڈو سے کرتا ہوا
یہ برفی کا دل سرد کرتا ہوا　　وہ زردے کا رنگ زرد کرتا ہوا
یہ کھچڑی کے چھکے چھڑاتا ہوا　　وہ فرنی پہ پھر پھر کے آتا ہوا
پُلاؤ کی ہستی مٹاتا ہوا　　یہ حلوے کے گولے بناتا ہوا
وہ سودے وا کبر کا ''آبِ لووَر''
یہاں خضر کی بے زبانی کا زور

جب جناب ساغر صدیقی کی باری آئی تو مشاعرے میں اُن کے پڑھنے سے پہلے ہی ہلچل مچ گئی، لوگوں نے کھڑے ہو کر تالیوں سے اُن کا استقبال کیا۔ ساغر نے ترنم کے ساتھ ایک غزل پڑھی، مشاعرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ دوسری غزل لوگوں کے اصرار پر پڑھی اور پھر تیسری غزل بھی لیکن لوگوں کا اصرار کہ مزید پڑھیے۔ ادھر اصرار ساغر کی طرف انکار، دیر تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن ساغر سٹیج پر لیٹ گئے اور مزید پڑھنے سے انکار دیا۔ اُن غزلوں کے جو چند اشعار یاد رہ گئے نذرِ قارئین ہیں۔

اے تغیرِ زمانہ یہ عجیب دل لگی ہے　　نہ وقارِ دوستی ہے نہ جمالِ دوستی ہے
وہ گزر گیا ہے ساغر کوئی قافلہ چمن سے　　کہیں آگ جل رہی ہے کہیں راکھ سو گئی ہے
ستم جاگتے ہیں کرم سو رہے ہیں　　محبت کے جاہ و حشم سو رہے ہیں
میرے نکتہ سازو! سخن کے خداؤ!　　پکارو! کہ لوح و قلم سو رہے ہیں
میری اُجڑی اُجڑی سی آنکھوں میں ساغر　　زمانے کے رنج و الم سو رہے ہیں

تیسری غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

آوارگی برنگِ تماشا بُری نہیں　　ذوقِ نظر ملے تو یہ دنیا بُری نہیں
بستی سے دور چل کہیں اے پاسِ وضعِ زیست　　مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بُری نہیں

مشاعرہ ختم ہوا تو دوستوں نے فیصلہ کیا کہ کہیں پر ساغر صدیقی کے ساتھ خصوصی نشست رکھی جائے۔ چنانچہ ہم چند دوست، جن میں عبدالخالق عزمی، عابد صدیق، عبدالرحمٰن شاکر، جابر علی سید اور چند دوسرے احباب شامل تھے، مشاعرے سے فارغ ہونے کے بعد ساغر کو سٹینڈرڈ بیکری کچہری روڈ کے مقابل واقع ریلیکس ہوٹل میں لے آئے اور

اُنھیں اپنا کلام عطا فرمانے کی درخواست کی۔ ساغر صاحب بڑے اچھے موڈ میں تھے اور خاصے خوش نظر آرہے تھے۔ اُنھوں نے اپنی خوبصورت شاعری سے ہمیں بہت نوازا۔ جب ہم تمام اپنے ادبی ذوق وشوق کو اُن کی غزلوں سے سیراب کررہے تھے تو اُنھوں نے نے دفعتاً اپنی جیب سے اپنا ٹیکہ نکالا اور ہمارے سامنے اپنے بازو میں لگا دیا۔ میں اُن کے قریب کی نشست پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ: ''ساغر صاحب اس طرح تو خدانخواستہ آپ مرجائیں گے'' جواب تھا: ''بھائی میرے! میں بالاقساط مر ہی تو رہا ہوں۔''

اس پر ہم حیران بھی ہوئے اور غمگین بھی۔ لیکن وہ جو کررہے تھے اس پر ہمارا کیا اختیار تھا، کاش وہ ایسا نہ کرتے۔ یہ محفل بھی ختم ہوئی تو کہنے لگے آپ میں سے کوئی مجھے امیرِ شریعت کے بیٹے ابوذر بخاری سے ملا سکتا ہے؟ میں جاتے جاتے اُن سے مل کر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس خدمت کے لیے فوراً خود کو پیش کیا۔ حضرت مولانا سید ابوذر بخاری قدس سرّہ اُن دنوں عموماً مجلس تحفظ ختمِ نبوّت کے پرانے دفتر میں، جو حسین آگاہی جاتے ہوئے راستے میں آتا تھا، بیٹھا کرتے تھے۔ ہم دونوں جب ہوٹل سے باہر آئے تو ساغر صاحب نے مجھے کہا کہ جہاں پر شاہ صاحب بیٹھتے ہیں وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ میں نے کہا کچھ زیادہ دور نہیں۔ کہنے لگے پھر پیدل ہی چلتے ہیں۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ کہنے لگے کہ اگر تانگہ کر لو تو زیادہ بہتر نہیں رہے گا؟ چنانچہ تانگے پر سوار سوئے منزل چل دیے۔ میں نے راستے میں اُن سے عرض کیا کہ آپ نے امیر شریعت کی وفات پر کوئی نظم نہیں کہی؟ (اُن دنوں میں حضرت شاہ جی امیرِ شریعت نوراللہ مرقدہ پر ایک کتاب ''شاہ جی'' کے لیے مواد اکٹھا کررہا تھا۔ اور میرے شاگرد ڈاکٹر انوار احمد میری معاونت کررہے تھے) وہ جواب میں کہنے لگے کہ سب سے پہلے تو میں نے ہی ایک نظم کہی جو روزنامہ آزاد میں شائع بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ بعد میں وہ نظم میں نے تلاش کر لی اور اس کو بھی شاملِ کتاب کر لیا۔ ہم دونوں حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے، شاہ جی اچانک ساغر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور پھر دونوں دیر تک شعروادب پر گفتگو فرماتے رہے۔ میں ساغر صاحب کو اُن کے ہاں ہی چھوڑ کر الوداع کیا اور گھر آ گیا۔

ساغر صاحب کیسے ملتان آئے:

ساغر صاحب کو مشاعرے میں شرکت کے لیے ملتان لانے کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ عبدالخالق عزمی لاہور سے اُنہیں لائیں۔ کیونکہ عزمی صاحب ابتدائی دور میں اے۔ جی آفس لاہور میں کام کرتے رہے تھے اور اس دوران اُن کی ساغر صاحب سے ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں اور وہ ان سے اچھی طرح آشنا تھے۔ عزمی صاحب بیان کرتے ہیں لاہور پہنچ کر میں سیدھا داتا دربار چلا گیا اور وہاں پر چند نشہ کرنے والوں کو جمع کر کے کہا کہ دیکھو جو ساغر صدیقی کو پکڑ کر میرے پاس یہاں لائے گا اس کو دس روپے انعام ملے گا۔ وہ یہ سن کر اِدھر اُدھر دوڑ گئے اور ایک گھنٹہ کے اندر ہی چار پانچ نشئی ساغر کو اس طرح پکڑے ہوئے آئے کہ ساغر صاحب ''مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو'' چلّا رہے تھے۔ عزمی صاحب کہتے ہیں پکڑ کر لانے والا ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ میں نے اسے پکڑا ہے۔ میں نے سب کو دس دس روپے دے کر فارغ کیا۔ اس کے بعد ساغر میرے

حوالے ہو گئے۔ کہنے لگے کہ یہ سب آپ نے کیا؟ اور ایسا کیوں کیا۔ کچھ دیر تک اُن کا موڈ خراب رہا۔ میں نے کہا کہ ساغر صاحب آپ سے ملاقات کو کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اب آپ ہی بتلائیں کہ آپ سے نیاز حاصل کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ بھی تھا؟ چنانچہ کچھ مائل بہ کرم ہوئے تو انہیں لے کر ہوٹل میں لے آیا اور کچھ دیر اُن سے چائے کی پیالی پہ گفتگو ہوئی جس کے بعد میں نے اُنھیں ٹیکسی پر بیٹھنے کو کہا تو کہنے لگے بھائی یہ مجھے آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ ایک جگہ آپ کو کسی دوست سے ملوانا ہے۔ وہ دوست آپ کی ملاقات کے لیے ایک مدت سے خواہش مند ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھ گئے لیکن اُن کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ جس سے ملاقات کے لیے ساغر صاحب کو کہا جا رہا ہے وہ اس سے ملنے کے خواہش مند نہیں۔ بہر حال ٹیکسی چل پڑی ٹیکسی والے کو پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا ملتان چلنا ہے۔ جب ٹیکسی شہر سے باہر آ گئی تو ساغر صاحب بگڑ گئے، مجھے چھوڑ و کہاں لے جا رہے ہو؟ عزمی صاحب نے کہا ملتان جا رہے ہیں وہاں ایک مشاعرے میں آپ کی شرکت بہت ضروری ہے۔ کہنے لگے مجھے کسی مشاعرے میں نہیں جانا، مجھے چھوڑ دو۔ عزمی صاحب نے بڑی منت خوشامد سے اُنھیں قائل تو کر لیا لیکن اس کے باوجود اُن کے تأثرات آمادگی والے نہیں تھے۔ کافی دور نکل جانے کے بعد کہنے لگے کہ اچھا مجھے ذرا ان کھیتوں میں رفع حاجت کے لیے جانا ہے۔ ٹیکسی روکو! ٹیکسی رک گئی۔ عزمی صاحب کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں تھا یہ یہاں سے بھی بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا، ساغر صاحب نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلد اُن پر قابو پا لیا۔ وہ بِا کراہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی پھر روانہ ہو گئی۔ جب ساغر صاحب نے دیکھا کہ اب میری جان چھوٹنے کی نہیں تو پھر وہ راضی ہو گئے۔ موڈ بھی ٹھیک ہو گیا اور پھر ملتان تک عزمی صاحب کے ساتھ بڑی اچھی بات چیت ہوتی رہی۔ اب عزمی اور ساغر دونوں دنیا میں نہیں ہیں اُن کی کہانی لکھی جا رہی ہے۔ عابد صدیق نے سچ کہا تھا:

عابد یہ آدمی کی اذیت کا دور ہے   اچھے رہے وہ لوگ یقیناً جو مر گئے
جھیلا تھا جس نے درد ملامت ہمارے ساتھ   ہے وقت سے سوال کہ وہ شخص کیا ہوا

ایس۔ای کالج بہاول پور میں تبدیلی، مارچ ۱۹۶۹ء:

گورنمنٹ کالج سول لائن ہمارے ایامِ ملازمت بہت اچھے گزر رہے تھے کہ اچانک سب سے پہلے عابد صدیق، رحیم یار خان تبدیل ہو گئے بعد میں عبدالرحمٰن شاکر بھی رحیم یار خان کالج چلے گئے جس کے بعد میری تبدیلی بھی ایس۔ای کالج بہاول پور میں کر دی گئی۔ یہ مارچ ۱۹۶۹ء تھا، جب ایوب خان ایک زبردست تحریک کے بعد معزول ہوئے اور اپنی جگہ جنرل یحیٰی خان کو بٹھا گئے۔ بہاول پور شہر میں مجھے دوسری مرتبہ آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پہلی بار حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جماعتِ احرار کی مجلس شوریٰ کی میٹنگ مولانا غلام مصطفیٰ صاحب کے مدرسہ دار العلوم مدنیہ بہاولپور میں رکھی تھی جس میں، میں نے بھی شرکت کی تھی۔ اُس وقت یہ مدرسہ زیرِ تعمیر تھا۔ بعد میں مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ وہ تین منزلہ مدرسہ سیکڑوں طالبانِ دین کو تعلیم دے رہا ہے۔ جس کو دیکھ کر طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ مہتمم صاحب نے میری بڑی عزت افزائی کی اور مہمانوں کی تأثرات کی کتاب میں بھی مجھ سے لکھوایا۔

بہاول پور میں شہر کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ اوّل تو کوئی یہاں آنا پسند نہیں کرتا اور اگر کبھی وہ اس شہر میں رہائش پذیر ہو جائے تو یہاں سے جانا بھی پسند نہیں کرتا۔

پہلے دن جب میں نے پرنسپل صاحب کے سامنے پیش ہو کر کالج (Join) جائن کیا تو مجھے بخار تھا۔ اس لیے فارغ ہوتے ہی فرید گیٹ کے ساتھ ڈاکٹر آفتاب کے کلینک میں گیا اُنھوں نے دوا دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے نئے معلوم ہوتے ہو، کہاں سے آئے ہو؟ میں نے بتایا کہ ملتان سے ایس۔ای کالج بطور لیکچرر سیاسیات آج ہی آمد ہوئی ہے، تو انھوں نے بھی مسکراتے ہوئے یہی کہا:

''بہاول پور اوّل تو کوئی آنا پسند نہیں کرتا لیکن اگر کچھ عرصہ رہ جائے تو پھر چھوڑ کر جانا بھی پسند نہیں کرتا۔''

میں نے اپنے چار سالہ قیام میں یہی بات محسوس کی کہ وہاں واقعی ایک خاص قسم کی کشش ہے۔ اس شہر کے پانی میں نہ جانے کیا تاثیر ہے کہ آدمی یہیں کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ خلوص و محبت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عابد صدیق میرے بعد یہاں آئے تو پھر بہاول پوری ہو گئے اور یہ بات صرف اُن تک ہی نہیں بلکہ ایسی دوسری اور مثالیں میرے علم میں ہیں۔ پروفیسر عطاء اللہ اعوان جنھوں نے زمانۂ طالب علمی میں ہی قادیانیت کو ترک کر کے اسلام قبول کیا، ان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ احمد پور شرقیہ میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے متاثر ہو کر اُسی جلسہ میں امیر شریعت کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ اس وقت وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پھر گھر واپس نہیں گئے۔ جلسہ ختم ہو گیا تو شاہ صاحب جانے لگے تو اس بچے نے شاہ جی کا دامن پکڑ کر کہا کہ:

''آپ مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ میرا سارا خاندان قادیانی ہے، میں اب کہیں نہیں جا سکتا مجھے اپنے ساتھ ہی لے چلیے۔''

امیر شریعت اُنھیں ساتھ ملتان لے آئے۔ ظاہر ہے کہ دفتر احرار تو جماعت پر مارشل لائی پابندیوں کی وجہ سے کہیں نہیں تھا۔ ملتان کے مجلسِ تحفظ ختمِ نبوّت کے دفتر میں اُنھیں ٹھہرانے کا بندوبست کیا، یہیں پر اعوان صاحب نے اپنی تعلیم حاصل کی اور پھر ایم۔اے کی تعلیم دفتر مجلسِ تحفظ ختمِ نبوّت کراچی میں رہتے ہوئے مکمل کی۔ اُنھوں نے میرے بہاول پور آنے سے ایک سال پہلے ۱۹۶۸ء میں ایس۔ای کالج میں اردو کے لیکچرار کے طور پر تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ اُنھوں نے بھی بہاول پور کو اپنا مستقر ہی بنا لیا۔ اسی طرح ایک اور پروفیسر رشید الزماں آئے تو یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ میں نے جب اس کالج میں پڑھانا شروع کیا تو میں یہاں پر ایک اجنبی تھا، کوئی شناسائی نہ تھی۔ لیکن کالج میں چند پروفیسرز نے میری پذیرائی کی اور مجھے احساسِ تنہائی نہ ہونے دیا۔ پروفیسر رحمت اللہ شاہ اور پرفیسر ہادی صاحب اور پروفیسر نذیر بھٹی اور چند دوسرے پروفیسر یہ حضرات جماعتِ اسلامی سے متاثر تھے اور شاید میرے نام سے پہلے ہی واقف تھے۔ کہتے ہیں کہ انسان کا تعارف ایک شہر سے دوسرے شہر اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ جاتا ہے، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا معاملہ ہوا۔ ان دوستوں میں چند روز بیٹھ کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس کالج میں پروفیسر حضرات دو دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک دھڑے کا تعلق جماعت اسلامی کے ساتھ

ہے تو دوسرا دھڑا، اینٹی جماعت ہے۔ مجھے جماعت اسلامی سے وابستہ دوست بار بار یہ کہتے کہ یہاں ایک پروفیسر طیب قریشی ہیں، وہ فارغ وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھتے ہیں اور اُن کے ساتھ کچھ سوشلسٹ پروفیسر بھی ہوتے ہیں۔ آپ اُن کے پاس مت جائیے گا وہ دینی طور پر کچھ اچھے اور صالح لوگ نہیں ہیں اور ایسے لوگوں میں بیٹھ کر دین کے خلاف باتیں سننا پڑتی ہیں۔ میں نے پہلے تو ایسی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن جب میرے ان دوستوں نے کئی بار یہی بات کہی تو میں نے سوچا کہ مجھے تو وہاں اُن کے درمیان ضرور بیٹھنا چاہیے تاکہ اُن کی جو دین کے خلاف جو غلط فہمیاں اور باتیں ہیں اُن کا جواب دینا چاہیے۔ میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ میرے مرشد سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تو پورے ہندوستان کے سوشلسٹ بھی آتے تھے۔ ہندوستان کے معروف کمیونسٹ دانشور سبطِ حسن اکثر امیر شریعت کے پاس آیا کرتے تھے۔ فیض احمد فیض، کے ایم اشرف اور ساحر لدھیانوی سمیت بائیں بازو کی فکر سے وابستہ کئی نامی گرامی مفکرین سے اُن کا میل جول اور احترام کا تعلق تھا۔ پھر اگر اپنے آپ پر، اپنے عقائد و نظریات پر اعتماد ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال ایک روز میں اس کمرے میں گیا تو کمرے میں موجود تمام پروفیسر حضرات نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا اور مجھے بہت اپنائیت کا احساس ہوا۔ یہیں پر میرا تعارف پروفیسر عطاء اللہ اعوان سے ہوا۔ شہر کے مشہور شاعر سہیل اختر سے یہیں پر پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ پروفیسر نواز قاسمی صاحب جو شعبۂ تاریخ سے وابستہ تھے یہیں پر مجھ سے متعارف ہوئے۔ پروفیسر نواز صاحب، معروف شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے بھانجے تھے اور بڑے پکے سوشلسٹ تھے۔ بعد میں اسلم انصاری بھی ملتان سے تبدیل ہو کر آ گئے کچھ عرصہ بعد عابد صدیق بھی ایک نئے روپ اور نئے رنگ میں یہاں آ گئے پھر وہی ملتان کا سا ماحول بہم میسر ہو گیا۔ چائے کی پیالی، سگریٹ کے کش اور مختلف علمی و ادبی و سیاسی موضوعات پر بحث و تمحیص، یہ سب کچھ میرے مزاج کے عین مطابق تھا لہٰذا میں اُن میں یوں گھل مل گیا کہ جیسے مدتوں سے اُن کے درمیان ہی تھا۔ ایسے میں مجھے احمد ندیم قاسمی کا شعر اکثر یاد آتا تھا کہ:

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر　　کسی بھی شہر میں جاؤں غریب شہر نہیں

میں نے مکان کی تلاش شروع کی لیکن تقریباً آٹھ ماہ تک مجھے کوئی مکان نہ ملا۔ اور عارضی رہائش کالج سے کچھ دور کالج کی ایسی عمارت میں تھی جہاں پہلے انٹر تک کی کلاسیں ہوتی تھیں، وہاں پر اکثر وہ پروفیسر رہائش پذیر تھے جن کے پاس رہائش کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہر ہفتے ملتان آتا اور بال بچوں سے مل کر پھر بہاول پور چلا جاتا تھا۔ اسلم انصاری بھی میرے ساتھ کالج کی اسی عمارت میں رہائش پذیر ہوئے۔ اس طرح ہم دونوں کے درمیان دن رات کی نشست رہنے لگی جو کافی لمبے عرصے تک جاری رہی۔ اب بھی کبھی کبھی اُن سے ٹیلی فون پر بات ہو جاتی ہے۔ ان کی رفاقت میرے ادبی ذوق میں گراں قدر اضافے کا باعث بنی۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں جتنے پروفیسر اور اساتذہ اردو سے نیاز حاصل کیا اُن جیسا ادب پر دسترس رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ (جاری ہے)